بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

فہم قرآن

جس طرح کسی شخص کے اعضاءِ رئیسہ میں فتور پیدا جاتا ہے تو اُس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے۔ معدہ وجگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج، عادات وخصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب چیزیں بدل جاتی ہیں۔ دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ کسی قوم کے اربابِ علم وفضل اُس قوم کے لیے قلب وجگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں، تو قوم کے افراد میں بھی صحت وتندرستی کے آثار پائے جائینگے لیکن اگر بدنصیبی سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے، خود ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے، اور خود ان میں آپس میں یکجہتی وہم خیالی، ہم مقصدی وہم آہنگی نہیں ہے، تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح پریشان ہیں، تو کوئی جائے استعجاب نہیں۔ اور اگر اُن کا "خاکسترِ قومیت" دوشِ ہوا پر جہالت ونادانی کے تیرہ وتار بیابانوں میں آوارہ پھر رہا ہے تو اُس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہیے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس چیز سے جماعت بنتی ہے یعنی احساسِ مرکزیت وہ سراسر ان میں مفقود ہے۔ ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر مسلمان ایک منئے

جذبۂ و آہنگ سے ہم کنار ہے۔ ایک مرض ہو تو اُس کی شکایت کیجیے، زخم ایک ہو تو اُس کے لیے تدبیرِ چارہ گری کی جا سکتی ہے، جب جسم ہمہ تن داغ بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ داماں و جیب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو انہیں سیا جا سکتا ہے لیکن اگر دستِ وحشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسانِ سوزن کاری و منتِ بخیہ گری اُٹھائیے۔ کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

ہر جماعت کی روح و رواں اُس کا مرکز ہوتا ہے۔ جب تک اُس قوم کے افراد میں مرکزی وابستگی پائی جائیگی اُن کی روح سرسبز و شاداب رہیگی۔ اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائیگا، اُن کی قومیت بھی مضمحل، کمزور اور از کار رفتہ ہوتی رہیگی۔ یہاں تک کہ اگر یہ احساسِ مرکزیت بالکل ناپید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اُس کے افراد تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں کی طرح منتشر، اور گریبانِ عاشق کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی دنیا الگ، ہر ایک کا مرکزِ خیال جدا، اور ہر ایک کا کعبۂ مقصود نیا ہوتا ہے۔ اُن میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور انفرادی تشتتِ خیال، ان کے نظامِ جماعت کے شیرازہ کو پریشان کرکے رکھ دیتا ہے
یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید کی زبانِ حق ترجمان نے اس طرح بیان کیا ہے:-

أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا	اللہ اور اُس کے رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا	کروگے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائیگی اور ہوا اُکھڑ جائیگی
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ	اور جیسی کچھ بھی مشکلیں مصیبتیں پیش آئیں، تم صبر کرو، اللہ انکا ساتھی ہے جو صبر

اس آیت میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے مرکز (اطاعت اللہ و رسولہ) سے انحراف اختیار کیا تو پامال ہو جاؤ گے، تمہاری قومی عظمت و سطوت کا قصرِ رفیع دھم سے زمین پر آ رہیگا، اور دوسری

قومیں تمہیں ایک لقمۂ تر سمجھ کر ہضم کرجانے کی کوشش کرینگی۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر کسی بات پر تم کو کسی سے اختلاف بھی ہو تو اس پر صبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اختلاف کے چند شعلوں کو فرطِ عناد و بغض کے دامن سے ہوا دے کر بن کی آگ بنا دو اور وہ تمہاری قومیت کے جسم و روح کو از فرق تا بقدم بھسم کرکے رکھدے۔

مسلمانوں کا مرکز کیا ہے: اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ مسلمانوں کا مرکز ایک اور صرف ایک ہی ہے، اور وہ قرآن ہے، اُن کی تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور اُن کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتہ کو منسلک ہیں۔ ان کی تمام اخلاقی، روحانی برتریوں اور بزرگیوں کا دار و مدار صرف اسی ایک کتاب مبین کے تعامل پر ہے۔ انہوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رُخ کیا۔ دشمنوں کی صفیں کی صفیں جو پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں دم کے دم میں اُلٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے سرنگوں و مفتوح ہوکر حق و صداقت کا پرچم اُڑانے لگے۔ انہوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لیے ہوئے جس کسی وادیٔ پرظلمت کی جانب اپنے عربی النسل گھوڑوں کی باگیں موڑیں تردد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں، اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتاب جہانتاب نے اس شان سے طلوع کیا کہ ع عالم تمام مطلع انوار ہوگیا۔

لیکن جب سے دنیا کے جھمیلوں میں پڑکر اُن کو قرآنِ حکیم سے بعد ہونا شروع ہوا، اُن کی روح قومیت بھی درماندہ ہونے لگی، اور آج اس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اُن کے ماتم میں دیدۂ و دل سے جتنا بھی خونِ جگر بہے کم، اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرارے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں۔

قرآن مجید کی مرکزیت سے تو کس مسلمان کو انکار ہوگا، مگر مشکل یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے فہم سے متعلق اب اس قدر زاویہائے نگاہ پیدا ہو گئے ہیں کہ اُن کی موجودگی میں محض مرکزیت کا اعتراف مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو اسوۂ حسنہ ماننے کے باوجود مسلمانوں میں پراگندگی خیال، تشتت اعمال، اور انتشار حیثیات و جذبات کی وبا عام ہو رہی ہے اور یہی وہ انتشار وافتراق ہے جو اُن کو ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیتا۔

آج کل قرآن مجید کے فہم کی نسبت دو اہم خیال پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک پر ہم اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور اِن دونوں خیالوں کا تجزیہ کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں تک درست اور کس حد تک قابل قبول ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل ان دونوں نظریوں کی تبلیغ بڑی شد ومد کے ساتھ کی جا رہی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اسلام کی تمام بھلائیوں کا دار و مدار اور مسلمانوں کی نجات کا تمام تر انحصار اپنے ہی خاص زاویۂ نگاہ کی نشر و اشاعت پر سمجھ لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا جائے، اور اُن کے لیے جو خندقیں کھودی جا رہی ہیں اُن میں اوندھے منہ گرنے سے انہیں بچا لیا جائے۔

آپ نے اکثر بعض تعلیم یافتہ حضرات کی زبان سے سنا ہوگا کہ قرآن مجید ہندوؤں کی آسمانی کتابوں کی طرح مشکل، پیچیدہ، ادق اور ناقابل فہم کتاب نہیں ہے جس کا علم وفہم، اور جس کے معانی کا ادراک صرف برہمنوں اور پنڈتوں تک محدود رہتا ہے، بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جس کے معانی کا ادراک ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی زبان کا بھی تھوڑا بہت علم رکھتا ہے۔ ان حضرات کا یہ فرمانا بجا اور درست ہے۔ اور وہ کیا خود قرآن مجید نے اپنے آسان ہونے کا اعلان کیا ہے:۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ ہم نے قرآن مجید کو ذکر کے لیے آسان کر دیا۔

لیکن اس خیال پر جن نتائج کی بنیاد رکھی جاتی ہے، ان کے پیش نظر ہم ان حضرات سے بھی وہی کہہ سکتے ہیں جو حضرت علی نے خوارج کے جواب میں فرمایا تھا۔ خوارج تحکیم کے خلاف تھے اور اپنے استدلال میں قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یعنی حکم تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے علیؓ اور معاویہؓ کو کیا حق ہے کہ غیر اللہ کو اپنے معاملات کے لیے حکم بنائیں" حضرت علیؓ نے یہ سُنا تو فرمایا:-

کلمۃُ حقٍ اُرِیدَ بہ الباطلُ یہ کلمہ حق ہے۔ مگر اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو لوگ قرآن کے آسان ہونے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ان کے الفاظ اگرچہ درست ہیں اور کسی مسلمان کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اگر ذرا اس ادعا کی گہرائیوں میں جائیے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان حضرات کا مقصد دعوتِ حق نہیں بلکہ اُن کے چند خاص اغراض و مقاصد ہیں جن کی تکمیل وہ اس دعوے کی آڑ میں کرنی چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کے آسان ہونے کے جو معنی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کرانا چاہتے ہیں وہ ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہیں۔ اور نہ وہ کسی صاحب انصاف کے نزدیک درخورِ پذیرائی ہو سکتے ہیں۔

یہ حضرات قرآن کے آسان ہونے سے حسب ذیل نتائج نکالتے ہیں:-

(۱) قرآن کے معنی سمجھنے کے لیے کسی خاص علم کا پڑھنا اور حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابنِ مسعود کرتے تھے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اور ہم میں اور دوسرے ائمہ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۳) اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے اُس کے فہم کے لیے کسی علم و راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھ کر اُس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے۔

پھر انہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے :-

(۴) فہم قرآن کے لیے کسی حدیث کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن ایک مکمل سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اسلامی احکام کی تمام کلیات و جزئیات اُس میں بیان کردی گئی ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کیے جائیں۔

ہر نیا قول جو کسی زمانہ میں کہا جاتا ہے۔ اور پھر اُس کا قائل اُسے بار بار دہراتا اور اُس پر اصرار شدید بھی کرتا ہے، اپنے عہد کے احوال اور گرد و پیش کی فضا سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس بنا پر آئیے اصل مسئلہ پر بحث و تمحیص کرنے سے قبل یہ معلوم کریں کہ اس طرح کا ادعا کب سے کیا جارہا ہے، اس کی تاریخ کیا ہے؟ اور اس میں اپنے زمانہ کے کن کن رجحانات و میلانات کا عکس نظر آتا ہے؟ ورنہ ظاہر ہے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اگر واقعی قرآن مجید ایسا ہی سہل ہے تو صحابۂ کرام میں پھر آپ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بعض بعض آیات کا مفہوم متعین کرنے میں کیوں اختلاف ہوا، اور اس کی کیا وجہ ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت کو بھی بہت بہت دنوں میں ختم کرسکتے تھے۔ ائمہ کرام اور مفسرین عظام کیا معاذ اللہ عقل باختہ تھے کہ اُنھوں نے ایک آسان سی بات سمجھنے کے لیے عمریں کی عمریں صرف کردیں اور پھر بھی اُس کا قرار واقعی حق ادا نہیں کرسکے۔ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر آسانیٔ قرآن کا ادعاء بایں معنی درست ہے تو اب تک علماء نے جو خون پسینہ ایک کیا وہ سب فضول تھا، اور اگر یہ درست نہیں ہے تو پھر اس ادعاءِ جدید کا محرک و اصل سبب کیا ہے؟ اور کیوں اس کو بار بار شد و مد کے ساتھ دہرایا جارہا ہے؟

اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ

قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں۔ اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبۂ جہاد (Fanaticism) بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبۂ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہتا ہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اُس کو ترساں و ہراساں نہیں کر سکتی۔ یہ خیال و اندیشہ تھا جس نے انگریز کو آتش زیر پا بنا رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہیے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے۔ اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی طہارت کا فتویٰ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ اُن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے کرام کا ہی وجود ہے۔ اور یہ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دامِ فریب میں آسکیں۔ اس بنا پر وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح علماء کا وقار ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر اُنھوں نے جو استیلاء و تسلط جما رکھا ہے اُس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انہیں سر سید اور اُن کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علماء کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سرے سے مذہب ہی کی بساط کمن اُلٹ کر رکھ دی۔ آپ سر سید کے مضامین پڑھیے، اُن کے ہم خیال شعراء کی نظمیں دیکھیے، آپ محسوس کرینگے کہ اُن میں کس آزادی کے ساتھ علمائے کرام پر آوازے کسے گئے ہیں کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں اُن پر چسپ کی گئی ہیں۔

ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب وشتم سے کام نہیں چلتا اس لیے علماء کے وقار کو ختم کرنے کے لیے اُنہوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی ایک طرف تو اُنہوں نے کہنا شروع کیا کہ "الدین یسر" دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق اُس کو سمجھ سکتا اور اُس پر عمل کر سکتا ہے۔ اور دوسری طرف اُنہوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں۔ انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ پھر کبھی اُنہوں نے اعلان کیا کہ دین ہے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لیے ابو حنیفہ، یا کسی غزالی و رازی کا دماغ وجانسوزی درکار ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں۔ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ دَخَلَ الْجَنَّۃَ "جس کسی نے لا الٰہ کہہ دیا جنت میں داخل ہو گیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں۔ الفاظ کی حد تک سب درست تھیں لیکن ان الفاظ کے قالب پر معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معرّا اور سادہ تھا۔ اور اُس پر جگہ جگہ اغراض فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اُسے سمجھ سکتا ہے اور اُس کے احکام معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے علماء کا جو وصف مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علماء اسلام کی ایک جماعت حقہ سے نفرت دلا کر کس اطمینانِ خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپگنڈے کی، اور جو کچھ یہ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے۔ جو کچھ دنوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی، مگر اب بعض مصالح کی خاطر سیاست کے حُدی خواں نے پھر اس نغمۂ کارواں کو گانا شروع کر دیا ہے۔